# انشورنس پالیسی

# اور

# اسلام

مصنف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی

(بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)


شعبۂ تحقیق واشاعت

Jamia Islamia Maseehul Uloom, Bangalore

K.S. Halli, Post Kannur Village, Bidara Halli Hobli, Baglur Main Road, Bangalore - 562149

H.O # 84, Armstrong Road, Mohalla Baidwadi, Bharthi Nagar, Bangalore - 560 001

Mobile : 9916510036 / 9036701512 / 9036708149

# فہرست مروجہ انشورنس پالیسی اور اسلام

# مروجہ انشورنس
# پالیسی اور اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مروجہ انشورنس پالیسی اور اسلام

## انشورنس کی حقیقت

انشورنس کے احکام پر گفتگو سے پہلے انشورنس کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ انشور انگریزی میں وثوق دلانے اور یقین دہانی کے معنے رکھتا ہے، اسی سے انشورنس ایک ایسے معاملہ کو کہا جاتا ہے، جس میں بعض شرائط پر ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے مستقبل میں پیش آنے والے امکانی خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی جاتی ہے، اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ شخص جس کے لئے خطرات سے حفاظت اور نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی گئی ہے، وہ ایک معینہ مدت تک ایک مقررہ رقم قسطوار دوسرے شخص کو ادا کرتا رہے، اگر اس مقررہ مدت کے درمیان اس کی جان و مال و املاک کو کوئی خطرہ لاحق ہو گیا تو یہ دوسرا شخص اسکو اس خطرہ سے بچائے گا، اور اس کے نقصان کی تلافی کرے گا، اور اس مقررہ مدت میں کوئی خطرہ پیش نہ آیا تو بالاقساط ادا کردہ پوری رقم، سود کے ساتھ واپس کر دی جائے گی، پھر اس قسطوار جمع شدہ رقم پر سود دینا، اور خطرات کے لاحق ہونے کی صورت میں نقصانات کی تلافی کرنا، دشوار گذار مرحلہ تھا، اس کو اسطرح حل کیا جاتا ہے کہ اس رقم کو سود پر دیا جاتا ہے، اور اس سے حاصل ہونے والے سود سے ان ذمہ داریوں کو پورا کیا جاتا ہے.

خلاصہ یہ ہے کہ انشورنس ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ابتداء قمار (جوئے) سے ہوتی ہے اور انتہاء سود پر، گویا انشورنس قمار اور سود دونوں کا مرکب ہے۔ حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے، جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، حقیقت میں کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربوا کے ساتھ غرر بھی پایا جاتا ہے۔

## انشورنس کی مختلف صورتیں

اس کے بعد واضح رہے کہ آج انشورنس کی مختلف قسمیں اور صورتیں رائج ہیں، اور بنیادی طور پر اس کی تین صورتیں ہیں: ایک زندگی کا انشورنس، دوسرے املاک کا انشورنس، اور تیسرے ذمہ داریوں کا انشورنس، ان تینوں انشورنس کی قسموں میں جو بات مشترک طور پائی جاتی ہے، وہ وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی کہ اسکی ابتداء قمار و جوئے سے ہوتی ہے، اور اس کا اختتام سود پر ہوتا ہے، یا یہ کہ اس کی بعض صورتوں میں سود ہے اور بعض میں قمار، لہٰذا ہم ان اقسام پر الگ الگ بحث کے بجائے اولاً اس کے بارے میں ایک اجمالی بحث کریں گے پھر بعض جزئیات پر الگ سے کلام کریں گے۔

## انشورنس میں سود اور سود کی شرعی تعریف

اب ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انشورنس کا یہ معاملہ جس کی وضاحت کی گئی ہے، سود اور قمار پر مشتمل ہے، مگر بعض لوگ یہ عجیب اور دلچسپ جھگڑا پیدا کرتے ہیں کہ انشورنس کے معاملہ میں جس کو انٹرسٹ (interest) کہا جاتا ہے، یہ شرعی سود نہیں ہے، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں جس کو سود کہا گیا ہے وہ اس سے مختلف دوسری چیز ہے۔ وہ یہ کہ خرید و فروخت میں ہم جنس اشیاء کو کمی پیشی کے

ساتھ لینا دینا جب کہ وہ مقداری ہوں، سود ہے، قرض میں زیادتی سود نہیں ہے۔ لہٰذا انشورنس کا معاملہ چونکہ قرض کی ایک شکل ہے، اس میں زیادتی شرعی ربوا نہیں ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں جس طرح خرید وفروخت میں سود اور ربوا ہوتا ہے اور وہ ناجائز ہے، اسی طرح قرض میں بھی اس کا تحقق ہوتا ہے، بلکہ زمانہ جاہلیت سے ربوا کی جو شکل رائج تھی وہ یہی قرض پر زیادتی والی تھی، امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں لکھا ہے کہ:

"ان ذالك الربوا انما عنى به ربوا القرآن الذى كان اصله فى النسيئة، و ذلك ان الرجل كأن يكون له على صاحبه الدين، فيقول له: اجّلنى منه الى كذا و كذا بكذ او كذا درهماً، ازيدكها فى دينك، فيكون مشترياً لاجل بمال، فنها هم الله عزوجل عن ذلك بقوله ﴿ **يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٰا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ** ﴾ (۱)

(اس ربا سے مراد قرآن کا ربا ہے جو کہ اصل میں قرض وادھار میں تھا، اور اس کی صورت یہ تھی کہ آدمی کا کسی پر قرض ہوتا تو وہ کہتا کہ مجھے اتنے درہم میں اتنی مدت مزید مہلت دو، میں تمہارے قرض میں اس کو بڑھا کر دوں گا، پس یہ شخص مال کے بدلے مدت کا سودا کرتا، لہٰذا اللہ نے اس آیت سے اس کو منع فرمایا)

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں:

" والربوا الذى عليه عرف الشرع شيئان : تحريم النساء و التفاضل فى العقود و المطعومات على ما نبينه، و غالبه ما كانت العرب تفعله من قولها للغريم : اتقضى ام تربى ؟ فكان الغريم يز يد فى عدد المال ويصير الطالب عليه، وهذا كله محرم باتفاق الائمة۔(۲)

(۱) شرح معانی الاثار للامام الطحاوی: ۱۹۱/۲ (۲) تفسیر القرطبی: ۳۴۸/۳

(اور وہ سود جس پر عرفِ شرع ہے دو چیزیں ہیں: ایک ادھار کا حرام ہونا اور ایک عقود و معاملات اور کھانے کی چیزوں میں کمی بیشی کرنا جیسا کہ ہم بیان کریں گے، اور زیادہ تر عرب لوگ جو کیا کرتے تھے وہ یہ تھا کہ وہ قرضدار سے کہتے: کیا قرض ادا کردوگے یا سود دوگے؟ پس قرضدار مال کی مقدار بڑھا دیتا، اور وہ اسی کا مطالبہ کرتا، لہٰذا یہ سب کا سب باتفاق ائمہ حرام ہے)

امام فخر الدین الرازیؒ فرماتے ہیں:

" اعلم ان الربوا قسمان: ربوا النسیئة و ربوا الفضل ـ اما ربوا النسیئة فهو الامر الذی کان مشهوراً متعارفاً فی الجاهلیة، و ذلك انهم کانوا یدفعون المال علی ان یأخذوا کل شهر قدراً معیناً، ویکون رأس المال باقیاً، ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون برأس المال، فان تعذر علیه الاداء زادوا فی الحق والاجل ، فهذا هو الربوا الذی کانوا فی الجاهلیة یتعاملون به الخ ـ(۱)

(جاننا چاہئے کہ ربا کی دو قسمیں ہیں: ایک ربا النسیئہ (ادھار کا سود) دوسرے ربا الفضل (زیادتی کا سود) ربا ادھار کا سود تو وہ جاہلیت میں مشہور و معروف تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ وہ کسی کو اس شرط پر مال دیتے تھے کہ وہ ہر ماہ ایک متعینہ مقدار لیں گے، اور اصل مال بھی ذمہ میں باقی رہتا، پھر جب قرض کی ادائیگی کا وقت آتا تو وہ قرضدار سے رأس المال کا مطالبہ کرتے، اگر وہ ادائیگی سے معذور ہوتا تو رقم اور مدت میں زیادتی کر دیتے، پس یہ ہے وہ سود جس کا معاملہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے)

حضرات ائمہ تفسیر و حدیث کے ان اقوال سے بصراحت ثابت ہوا کہ جاہلیت

(۱) التفسیر الکبیر للامام الرازی: ۳۵۱/۲

کے لوگ جس ربوا کا معاملہ کرتے تھے وہ قرض پر زیادتی ہے،اور قرآن نے اولاً اسی کو حرام وممنوع قرار دیا ہے۔ رہا بیع وتجارت میں ربا کا معاملہ تو وہ بھی بلا شبہ حرام ہے،مگر زمانۂ جاہلیت کے لوگ اس کو ربوا نہیں سمجھتے تھے،لہٰذا جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کو بھی ربوا کے ساتھ ملحق قرار دیا اور اس کو سختی کے ساتھ روکا ہے۔

غرض یہ کہ قرض پر زیادتی بھی سود ہے، بلکہ اصل سود ہے،اس میں شبہ پیدا کرنا، نہایت درجہ کی غیر معقول حرکت ہے، جب کہ یہی وہ ربوا ہے، جو زمانۂ جاہلیت میں متعارف تھا، اور اس سے قرآن نے بصراحت منع کیا ہے۔اس تفصیل کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ انشورنس کے معاملہ میں قرض پر جو سود دیا جاتا ہے وہ شرعی سود وربوا ہی ہے،جس کا حرام ہونا بنص قطعی ثابت ہے۔

## ذاتی ضروریات اور کاروباری ضروریات پر سودی قرض

البتہ یہاں ایک اور بحث ہے جس کو بعض ناخدا ترس لوگوں نے چھیڑا ہے،وہ یہ کہ ذاتی ضروریات پر سودی قرض اور کاروباری ضروریات پر سودی قرض میں فرق ہے کہ پہلی شکل میں زیادتی تو ربوا ہے اور حرام ہے،مگر دوسری شکل میں زیادتی سود اور ربوا میں داخل نہیں۔ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ عرب لوگ زمانۂ جاہلیت میں جو قرض لیتے تھے، وہ صرف اپنی ذاتی اغراض وضروریات کے لئے ہوتا تھا اور قرآن نے اسی قرض پر زیادتی کو حرام قرار دیا ہے،اور اس زمانے میں کاروباری اغراض اور ضروریات کے لئے قرض لینے دینے اور اس پر سود لینے دینے کا طریقہ رائج نہیں تھا، اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ عرب میں کاروباری اغراض کے لئے سودی قرضے کا رواج نہ تھا،تب بھی اس بات کی قرآن وحدیث میں

کیا دلیل ہے کہ شخصی و ذاتی اغراض کے لئے سودی قرض، اور کاروباری اغراض کے لئے سودی قرض میں فرق ہے؟ مذکورہ دلیل سے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ سودی قرض کی ایک شکل جاہلیت میں رائج تھی، دوسری رائج نہ تھی۔ مگر یہ تو ثابت نہ ہوا کہ ان میں حکم کے لحاظ سے کوئی جوہری فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کاروباری ضروریات کے لئے قرضے کا رواج عرب میں نہ تھا، تو کیا دنیا کے اور خطوں اور حصوں میں بھی نہ تھا؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے ممالک میں سرکاری اور کاروباری قرضوں کا رواج تھا، بلکہ خود عرب میں بھی کاروباری وتجارتی قرضوں کا رواج تھا، چنانچہ یہاں اس کے چند حوالے پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) بخاری میں حضرت زبیر بن العوامؓ کے بارے میں موجود ہے کہ ان کے پاس لوگ امانت رکھنے مال لاتے، تو وہ کہتے کہ نہیں، بلکہ تم مجھے یہ قرض دیدو، پھر اس کو تجارت میں لگاتے تھے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے یہ الفاظ حضرت زبیرؓ کے متعلق موجود ہیں: انما کان دینه الذی علیه ان الرجل کان یأ تیه بالمال فیستودعه ایاه، فیقول الزبیر: لا ولکنه سلف، فانی اخشی علیه الضیعة. (۱)

اس میں حضرت زبیرؓ کا قرض لینا مذکور ہے، مگر یہ کہ قرض کیوں لیتے تھے،؟ اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اسکی وجہ میں فرماتے ہیں: و کان غرضه بذلك انه کان یخشی علی المال ان یضیع، فیظن به التقصیر فی حفظه فرای ان یجعله مضموناً فیکون اوثق لصاحب المال وابقی لمروئته ، زاد ابن بطال: ولیطیب ربح ذلك المال. (۲)

(۱) بخاری کتاب الجهاد، باب فرض الخمس: ۲۸۹۷ (۲) فتح الباری: ۲۳۰/۶

(اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ وہ مال کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس کرتے تھے، جس سے کوئی ان کے بارے میں یہ گمان کرسکتا تھا کہ حفاظت میں کوتاہی کی ہے، اس لئے چاہا کہ اس مال کو واجب الادا قرار دیدیں تا کہ وہ مال والے کے لئے زیادہ وثوق کا سبب بنے اور خود کی مروت بھی لوگوں کی نظر میں باقی رہے، ابن بطال نے یہ بات بھی کہی ہے کہ آپ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ تا کہ اس مال کا نفع آپ کے لئے حلال ہو سکے)

اس میں ابن بطال کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلف (قرض) کا ایک مقصد تجارت بھی تھی جس سے نفع کمایا جاتا تھا، اور آپ اسی لئے امانت کے بجائے اس مال کو قرض کی شکل میں لیتے تھے کہ اس سے نفع کمایا جائے۔

(۲) اس دلیل سے زیادہ صریح یہ ہے کہ امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ وعبید اللہ رضی اللہ عنھما ایک موقع پر بصرہ گئے اور حضرت ابوموسی اشعریؓ جو اس وقت وہاں کے امیر تھے ان سے ملاقات کی، تو حضرت ابوموسیؓ نے فرمایا کہ میں تم کو نفع پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مجھ سے بیت المال کا قرض لے لو اور اس سے بغرض تجارت کچھ مال خرید لو اور مدینہ پہنچ کر اسے فروخت کر کے نفع اٹھالو اور اصل مال بیت المال میں داخل کر دینا، چنانچہ انھوں نے ایسے ہی کیا الخ۔ (۱)

دیکھئے کس قدر صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت کی غرض سے قرض لینے کا رواج تھا۔

(۳) روح المعانی میں ہے کہ بعض قبیلے، دوسرے قبیلوں سے قرض سود پر لیا کرتے تھے، چنانچہ آیت ﴿ يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْ ا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ

(۱) مؤطا امام مالک، کتاب القرض: ۲۸۵

**الرِّبوٰا اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ﴾** [بقرة:٢٧٨] کے تحت لکھتے ہیں:

" نزلت فی العباس بن عبد المطلب و رجل من بنی مغیرة کانا شریکین فی الجا هلیة یسلفان فی الربا الی ناس من ثقیف من بنی عمرة واخرج ابن ابی حاتم عن مقاتل قال: نزلت هذه الا یة فی بنی عمرو بن عمیر بن عوف الثقفی، و مسعود بن عمروبن عبد یالیل بن عمرو، وربیعة بن عمرو، وحبیب بن عمرو، وکلهم اخوة وهم الطالبون، والمطلوبون بنو المغیرة من بنی مخزوم وکانوا یداینون بنی المغیرة فی الجاهلیة بالربا ". (۱)

(یہ آیت عباس بن عبد المطلب اور قبیلۂ بنومغیرہ کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو زمانۂ جاہلیت میں شریک کاروبار تھے، اور بنوعمرہ کی شاخ بنوثقیف کے لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، اور ابن ابی حاتم نے حضرت مقاتل سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت بنوعمرو بن عمیر بن عوف ثقفی اور مسعود بن عمرو بن یالیل بن عمرو اور ربیعہ بن عمرو اور حبیب بن عمرو کے بارے میں اتری ہے، یہ سب بھائی تھے اور یہ قرضخواہ تھے اور بنومخزوم کی شاخ بنومغیرہ ان کی مقروض تھی، وہ لوگ بنومغیرہ کو سود پر زمانۂ جاہلیت میں قرض دیا کرتے تھے)

یہ دونوں قبیلے جاہلی دور کے دو مالدار قبیلے تھے اور تجارت کے میدان میں بہت آگے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ قبیلہ کا قبیلہ سے قرض لینا شخصی ضروریات کے لئے ہو نہیں سکتا، لامحالہ یہ قرض کاروباری ضروریات کیلئے لیا جاتا تھا۔

اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں تجارت کا بھی ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: هذا حکم

---

(۱) روح المعانی: ۵۲/۳-۵۳

من الله لمن اسلم من كفار قريش و ثقيف و من كان يتجر هنالك .(۱)

الغرض یہ بات کہ شخصی قرضوں پر سود حرام نہیں، غلط اور غیر معقول بات ہے، نہ فقہ کے اصول اس کا ساتھ دیتے ہیں اور نہ تاریخ ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے، بلکہ جیسا کہ گزرا تاریخ اس کے خلاف شواہد پیش کرتی ہے۔

## انشورنس میں دوطرح کا سودی معاملہ ہے

پھر انشورنس میں سودی معاملہ دوطرح کا ہے، ایک تو انشورنس کمپنی انشورنس کے طالب سے رقم وصول کر کے دوسرے حاجت مندوں کو سود پر قرض دیتی ہے، لہٰذا یہ طالب، انشورنس کمپنی کا سودی کاروبار میں معاون ہوگا، اور سودی کاروبار کے تعاون کا حرام ہونا محتاج بیان نہیں۔ حدیث میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ :﴿ لعن رسول الله ﷺ آكل الربا و موكله و كاتبه و شا هديه وقال هم سواء﴾

(رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، سودی حساب لکھنے والے اور اس معاملے پر گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں)(۲)

علامہ نوویؒ شارحِ مسلم نے اس حدیث پر لکھا ہے کہ: فيه تحريم الاعا نة على الباطل. (اس حدیث میں باطل کاموں پر مدد و تعاون کا حرام ہونا مذکور ہے)(۳)

دوسرے یہ کہ انشورنس کمپنی ان طالبین کو ان کی جمع کردہ رقم پر پالیسی کے مطابق سود دیتی ہے، اور یہ صریح حرام ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔

(۱) تفسیر قرطبی: ۳۶۱/۳ (۲) مسلم: ۲۷/۲ (۳) شرح مسلم للنووی: ۲۸/۲

# انشورنس میں قمار اور قمار کی تعریف

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، انشورنس کی ابتداء قمار (جوئے) سے ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ بیمہ شدہ شخص یا شئی، وقت معین سے پہلے تلف ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی، اور اس وقت کے بعد تلف ہو تو اتنی، جب کہ تلف ہونے کا وقت متعین نہیں اور نہ ہوسکتا ہے، اور اسلام میں جس کو قمار (جوا) کہا گیا ہے، اس کی حقیقت بس یہ ہے کہ نفع ونقصان کو غیر معین و نامعلوم بات پر معلق وموقوف کیا جائے کہ اگر وہ واقع ہو جائے تو نفع ہو اور اگر واقع نہ ہو تو نقصان۔ علامہ ابن نجیم المصری اور علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"لان القمار من القمر الذی یزداد تارةً و ینقص اخری، وسُمّی القمار قماراً لان کل واحد من المقامرین ممن یجوز ان یذهب ماله الی صاحبه ویجوز ان یستفید مال صاحبه وهو حرام بالنص۔(۱)

(کیونکہ قمار قمر سے ماخوذ ہے جو کبھی بڑھتا ہے اور کبھی گھٹتا ہے، اور قمار کو قمار اس لئے کہا جاتا ہے کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک ممکن ہے کہ اس کا مال دوسرے کے پاس چلا جائے اور یہ بھی امکان ہے کہ دوسرے کا مال یہ ہڑپ لے، اور یہ نص سے حرام ہے)

اور" التعریفات الفقهية" کے مؤلف علامہ عمیم الاحسانؒ صاحب فرماتے ہیں:
القمار مصدرقامر هو کل لعب یشترط فیه غالباً ان یا خذ الغالب شیئاً من المغلوب، واصله ان یاخذ الواحد من صاحبه شیئاً فشیئاً فی اللعب،ثم عرفوه بانه تعلیق الملك علی الخطر والمال فی الجانبین. (۲)

(۱)البحر الرائق:۸/۵۵۴،ردالمحتار للشامی:۶/۴۰۳

(۲)التعریفات الفقہیۃ،مندرجہ قواعد الفقہ:۴۳۴

(قمار: "قَامَرَ" کا مصدر ہے اور وہ ہر ایسا کھیل ہے جس میں اکثر یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جو جیتے گا وہ ہارنے والے سے کچھ لے گا، اور اس میں اصل یہ ہے کہ کھیل میں اپنے ساتھی سے تھوڑا تھوڑا کر کے لے، پھر علماء نے اس کی تعریف یہ کی کہ قمار ملک کو کسی خطرہ پر معلق کرنا ہے جبکہ مال دونوں طرف ہو)

غرض یہ کہ انشورنس میں جو یہ شرط ہوتی ہے کہ فلاں شخص (جس کی زندگی کا بیمہ ہوا ہے) یا فلاں شئی (جس کا بیمہ ہوا ہے) اگر مقررہ مدت کے اندر مرے یا ہلاک ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی، یعنی نفع ہوگا اور اگر اس مدت کے بعد مرے یا ہلاک ہو تو اتنی رقم ملے گی یعنی پہلے کی بنسبت نقصان ہوگا، یہ ایسی شرط ہے جس کا وجود و عدم غیر معین و مبہم ہے، اور ایسی شرط پر معاملہ کو دائر کرنا صریح قمار ہے۔

حدیث میں اسی بنا پر "رُقبیٰ" کی ممانعت آئی ہے، ابوداؤد و نسائی میں ہے: ﴿عن زيد بن ثابت قال قال: رسول الله ﷺ ولاتُرْقِبُوْا﴾ (کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رقبی نہ کرو)(۱)

اور رقبی کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو یوں کہے کہ اگر تو پہلے مر جائے تو یہ مکان میرا ہے اور اگر میں پہلے مر جاؤں تو تیرا ہے۔(۲)

علامہ قرطبیؒ، امام مالکؒ اور کوفیین (امام ابوحنیفہؒ و محمدؒ) کی جانب سے اس کے ممنوع ہونے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں: لان كل واحد منهم يقصد الى عوض لايدرى هل يحصل له، ويتمنى كل واحد منهما موت صاحبه. (۳)

## ایک شبہ کا جواب

یہاں یہ ممکن ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ رقبی اگر قمار پر مشتمل ہے، تو اس کو تمام ائمہ

(۱) ابوداؤد:۳۰۷۶، نسائی:۳۶۷۱ (۲) بذل المجهود:۳۰۱/۵، تفسیر القرطبی:۲۹۹/۱
(۳) تفسیر القرطبی:۲۹۹/۱

نے حرام کیوں نہیں قرار دیا؟ امام ابو یوسف ؒ، امام شافعیؒ وغیرہ اس کے جواز کے قائل ہیں، یا خود قمار میں کوئی گنجائش ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جن ائمہ نے اسکو ناجائز قرار دیا ہے، انھوں نے اس کی تفسیر وہی کی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ ملک کو موت پر معلق رکھا گیا ہو، اور جن حضرات نے اس کو جائز کہا ہے، وہ رقبی کی مذکورہ تعریف وصورت ہی کو تسلیم نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ رقبی کی صورت یہ ہے کہ کسی کو ہبہ کردیا جائے اور ساتھ یہ شرط کی جائے کہ اگر تو پہلے مرا تو یہ مکان مجھے واپس مل جائے، ورنہ نہیں، اس صورت میں ملک کو موت پر معلق نہیں رکھا گیا ہے بلکہ واپسی کو موت پر معلق رکھا گیا ہے۔ یہ ہبہ بہ شرطِ فاسد ہے۔

علامہ خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تقریر میں ہے کہ:

" قد اختلف فيه ( اى فى الرقبى ) ائمتنا الثلاثة، فمن جوزها اراد بالرقبى الهبة بشرط ان ترجع الى الواهب لومات الموهوب له قبله، ومن ابطلها فسرها بتعليق التمليك على الموت السابق من ايهما، كأن يقول له : ان مت قبلي فهو لى وان مت قبلك فهو لك ،وهو باطل لا محا لة لان تعليق التمليك على شرط هو على خطر الوجود قمار، فكان الخلاف لفظياً مبنياً على اختلاف تفسير الرقبى . (۱)

(ہمارے ائمہ ثلاثہ نے رقبی کے جواز میں اختلاف کیا ہے، پس جنھوں نے جائز کہا ہے، انہوں نے رقبی سے وہ ہبہ مراد لیا ہے، جو موہوب لہ کے پہلے مرجانے پر واہب کو واپس مل جانے کی شرط پر ہو، اور جنہوں نے اس کو باطل کہا ہے، انہوں نے

(۱) بذل المجهود :۳۰۱/۵۔۳۰۲

اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ ملک کا پہلے واقع ہونے والی موت پر معلق کرنا چاہے جس کی بھی ان دونوں (دینے اور لینے والوں) میں سے پہلے ہو جائے، مثلاً یوں کہے کہ اگر تو مجھ سے پہلے مر جائے تو یہ میرا ہے اور اگر میں تجھ سے پہلے مر جاؤں تو وہ تیرا ہے، اور یہ لامحالہ باطل ہے؛ کیونکہ ملک کو ایسی شرط پر معلق کرنا جو خطرہ میں ہو، وہ قمار ہے، لہٰذا یہ اختلاف لفظی ہے جو رقبی کی تفسیر کے اختلاف پر مبنی ہے)

حاصل یہ کہ قمار کا حرام ہونا اپنی جگہ مسلمہ حقیقت ہے، اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں رقبیٰ کی صورت وتعریف میں اختلاف ہے، جنہوں نے اس کو قمار کی شکل دی وہ ناجائز قرار دیتے ہیں اور جنہوں نے دوسری صورت دی وہ جواز کے قائل ہیں۔ بہر حال انشورنس میں چونکہ قمار صاف طور پر موجود ہے، اس لیے یہ ناجائز ہوگا۔

## انشورنس کے مصالح اور حکم شرعی میں ترمیم کا مسئلہ

اب رہا یہ سوال کہ انشورنس کے معاملہ میں بڑی مصلحتیں ہیں، لہٰذا ان مصالح کے پیش نظر کیا اس کی اجازت ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مصالح کا اعتبار وہاں کیا جاتا ہے جہاں مقاصدِ شریعت فوت نہ ہوتے ہوں اور جہاں مقاصدِ شریعت فوت ہوتے ہوں، وہاں مصالح کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا، پھر مصالح کے اعتبار کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں حکم منصوص نہ ہو، اور یہاں ایک تو حکم منصوص ہے اور وہ ہے سود کا حرام ہونا، اسی طرح قمار کا حرام ہونا، دوسرے ان مصالح کے اعتبار کرنے سے مقاصد شریعت (جو سود کی حرمت سے متعلق ہیں) فوت ہو جاتے ہیں، لہٰذا ان مصالح کا اعتبار کر کے انشورنس کے جواز کا فتوی کسی طرح نہیں دیا جا سکتا۔

پھر وہ مصالح جن کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی تحصیل کچھ اسی معاملہ پر منحصر نہیں

ہے کہ اس میں جواز تلاش کیا جائے، بلکہ شریعت نے ان مصالح کی تحصیل کے لئے دوسری صورتیں تجویز فرمائی ہیں، جیسا کہ اس کا ذکر آئے گا۔

## انشورنس میں مفاسد

پھر مصالح پر نظر کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ اس کے مفاسد پر بھی نظر کریں؛ کیوں کہ اگر صرف مصالح کو دیکھا جائے تو بلا شبہ ہر اچھی اور بری چیز میں کچھ نہ کچھ مصالح نظر آئیں گے، حتیٰ کہ قرآن نے شراب اور جوئے میں بھی منافع ومصالح کا ہونا تسلیم کیا ہے، چنانچہ فرمایا ہے: ﴿ يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ کَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ﴾ [البقرة:۲۱۹]

مگر منافع ومصالح کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کو حلال اس لئے نہیں قرار دیا گیا کہ اس میں مفاسد بھی ہیں اور انہی مفاسد کی طرف " إثْمٌ کبيرٌ" کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اور " اثم " کا بمعنے مفسدہ ہونا صحیح ہے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے: "الاثم بمعنى المفسدة في قول ".(۱)

الغرض اس سے معلوم ہوا ہے کہ صرف مصالح پر نظر کرنا کافی نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کچھ مفاسد بھی ہیں یا نہیں؟ اور یہ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں بڑے مفاسد بھی ہیں، مثلاً بیمہ اور انشورنس کی رقم وصول کرنے کے لئے وارث نے بیمہ دار کو قتل کر دیا، یہ کتنا بڑا مفسدہ ہے۔

غور کیجئے کہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد صرف جان یا مال سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ روح سے بھی تعلق رکھتے ہیں، مثلاً دشمنی، حسد وبغض، جھوٹ، مکرو

(۱) روح المعانی:۱۱۵/۲

فریب وغیرہ۔ان روحانی مفاسد کے ہوتے ہوئے انشورنس کے مصالح کے پیش نظر اس کے جواز کا فتوی نہیں دیا جاسکتا۔اسلام میں جانی و مالی مصالح سے زیادہ، روحانی مصالح قابلِ اعتناء ہوا کرتے ہیں۔

## انشورنس کی مختلف صورتوں میں فرق ہے یا نہیں؟

اس پر میں نے پہلے ہی روشنی ڈالی ہے کہ انشورنس کی مختلف صورتیں ہیں، مگر ان میں سے بیشتر صورتوں میں حکم کے لحاظ سے کوئی جوہری فرق نہیں، کیونکہ ان میں سے کسی صورت و شکل میں سود پایا جاتا ہے، تو کسی میں قمار پایا جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں دونوں پائے جاتے ہیں، لہٰذا یہ شکل وصورت کا تفاوت وفرق ہے، معاملہ کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے، البتہ بعض صورتیں دائرۂ جواز میں داخل ہوسکتی ہیں، جیسا کہ بحث آرہی ہے۔

انشورنس کی بہت سی شکلیں اور صورتیں ہیں، زیادہ معروف ورائج صورتیں یہ ہیں: (۱) زندگی کا انشورنس جس کو LIFE INSURANCE کہا جاتا ہے (۲) املاک کا انشورنس (۳) ذمہ داریوں کا انشورنس (۴) مڈیکل انشورنس وغیرہ۔ لہٰذا یہاں ان پر مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

## (۱) لائف انشورنس کا حکم

لائف انشورنس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بیمہ کرنے والا کا بیمہ کمپنی کی جانب سے مڈیکل معائنہ کرایا جاتا ہے، اور اس کی رپورٹ کے مطابق اس شخص پر اگر کوئی حادثہ اور ناگہانی آفت نہ آئی، تو مثال کے طور پر تیس سال یا بیس سال زندہ رہ سکتا ہے، تو کمپنی اتنے سال کے لئے اپنی شرائط کے مطابق لائف انشورنس کر لیتی ہے، اور اس شخص کو ہر ماہ ایک متعینہ رقم کمپنی میں بھرتے رہنا پڑتا ہے، پس اگر وہ مڈیکل

رپورٹ کے مطابق بیس یا تیس سال پر مرجاتا ہے یا مدت مذکورہ سے پہلے مرجاتا ہے تو اس کی جمع شدہ رقم مع سود اس کے وارثین کو دیدی جاتی ہے، اور اگر اس مدت میں اس کی موت واقع نہ ہوئی تو خود اسی کو وہ رقم مع سود مل جاتی ہے۔

اس کا حکم واضح ہے کہ یہ ناجائز ہے، کیونکہ اس میں ایک تو سودی معاملہ ہے اور دوسرے جوا اور قمار بھی ہے، اور- جیسا کہ عرض کیا گیا- یہ دونوں چیزیں اسلام میں سخت حرام و ناجائز ہیں، اس لئے جو معاملہ ان دونوں سے مرکب ہو، وہ بدرجۂ اولی حرام و ناجائز ہے۔

## ہندوستان کے موجودہ حالات میں لائف انشورنس

مگر یہاں بعض حضرات نے ایک سوال اُٹھایا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں، جہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ رہتا ہے اور مسلمانوں کی جانیں اور املاک بالکل محفوظ نہیں رہتیں، بلکہ بسا اوقات مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں تباہ و ہلاک کردی جاتی ہیں، کیا اس کی گنجائش ہے کہ محض اپنی جان کی حفاظت کی خاطر لائف انشورنس کرایا جائے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ:

(ا) کسی عام حادثہ میں مارے جانے میں اور فرقہ واریت میں مارے جانے میں کوئی فرق نہیں، اگر ایک شخص اس لئے انشورنس کراتا ہے کہ کسی عام حادثہ میں مارے جانے کی وجہ سے مصائب پیش آتے ہیں تو اس کا ناجائز ہونا مسلم ہے، تو اگر کوئی اس لئے انشورنس کراتا ہے کہ فرقہ واریت میں مارے جانے سے مصائب کا سامنا ہوگا تو اس کے جائز ہونے کی کیا علت ہے؟ اور آخر ان دونوں میں بنیادی اور جوہری طور پر کیا فرق ہے؟

(۲) دوسرے اس سلسلہ میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ لائف انشورنس کرانے سے حکومت ہماری جانوں کی ذمہ دار ہو جاتی ہے، اور فسادات کی صورت میں حفاظت کا چست نظام بنا کر فرقہ واریت کو ختم کرسکتی ہے، یہ محض ایک خام خیالی ہے، کیونکہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ فرقہ واریت میں ہونے والے حوادث کی انشورنس کمپنی ذمہ دار نہیں ہوتی۔

(۳) تیسرے یہ کہ کیا انشورنس کرانے کی صورت ہی میں حکومت ہماری جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے؟ کیا اس کے بغیر وہ اس کی ذمہ دار نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر وہ کیوں حفاظت نہیں کرتی؟ اور اگر ذمہ دار ہونے کے باوجود وہ اس میں کوتاہی کرتی ہے تو کیا یقین ہے کہ انشورنس جیسی حرام چیز کا ارتکاب کرنے کے باوجود وہ اپنی ذمہ داری کو پوری کرے گی؟

(۴) اگر ان حالات کی وجہ سے انشورنس کو جائز قرار دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ جواز صرف ان حالات کے زمانے میں ہوگا یا ہر زمانے میں؟ اگر اس کا زمانہ محدود ہوگا تو اس کی حد کیا ہوگی؟ کیونکہ حالات تو ہر وقت یکساں نہیں رہتے، جس طرح عافیت کے حالات یکساں نہیں ہوتے اسی طرح فسادات کے حالات بھی یکساں نہیں ہوتے، تو یہ جواز کب تک کے لیے ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا متعین کرنا ایک متعذر امر ہے، اس لئے یہ متعین تو کیا نہ جا سکے گا، لامحالہ اس کو غیر محدود طور پر جائز کہنا پڑے گا، چاہے حالات کچھ بھی ہوں، تو کیا اس کی کوئی اہل علم و دین اجازت دے سکتا ہے؟

الغرض لائف انشورنس کی گنجائش دینا بلا وجہ ایک حرام کو حلال کرنے کے مترادف ہے، اور اس میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ سراسر مفاسد ہیں، لہٰذا یہ سوال خارج از بحث ہے۔

## (۲) املاک کا انشورنس

املاک واشیاء کے انشورنس میں یہ ہوتا ہے کہ طالبِ انشورنس ایک مقررہ مدت مثلاً تین ماہ یا چھ ماہ یا سال بھر کے لیے انشورنس کمپنی کے شرائط وضوابط کے مطابق، ایک متعینہ رقم جمع کرتا رہے گا، اور اس طے شدہ مدت کے درمیان اگر وہ املاک کسی حادثہ کا شکار ہو جائے، تو انشورنس کمپنی اس کے نقصان کی تلافی کرتی ہے، اور اگر اس مدت میں اس املاک پر کوئی حادثہ نہیں پیش آیا تو وہ جمع شدہ رقم کمپنی واپس نہیں کرتی، بلکہ خود رکھ لیتی ہے۔

اس صورت کا حکم بھی یہی ہے کہ یہ نا جائز ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر چہ کہ سود نہیں آتا؛ کیونکہ کمپنی کوئی رقم واپس نہیں کرتی، لیکن اس صورت میں قمار پایا جاتا ہے، کیونکہ املاک کو نقصان پہنچنے اور نہ پہنچنے دونوں کا امکان ہے، اگر نقصان ہوا اور کمپنی نے اس کی تلافی کی تو فائدہ ہو گیا، اور اگر نقصان ہی نہ ہوا اور تلافی کی نوبت ہی نہ آئی تو بیمہ کرانے والے کا نقصان ہوا، اس طرح یہ معاملہ نفع و نقصان کے درمیان دائر ہونے کی وجہ سے قمار میں داخل ہے۔ علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی فرماتے ہیں کہ:

" لان القمار من القمر الذي يزداد تارة و ينقص أخرى وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه و يجوز أن يستفيد مال صاحبه ........ وهو حرام بالنص .(۱)

## بعض علماء کی غلط فہمی

اس مسئلہ میں بعض علماء کو علامہ شامی کی ایک عبارت سے دھوکہ لگا ہے، اور

(۱) البحر الرائق: ۸/ ۵۵۴، الشامي: ۶/ ۴۰۳

انہوں نے املاک کے بیمہ کی ایک تاویل سے اجازت دی ہے، چنانچہ مفتی شبیر احمد صاحب (مفتی دارالافتاء، مدرسہ شاہی، مرادآباد) نے کہا کہ

''املاک کے بیمہ میں سود نہیں ملتا، البتہ اس میں قمار پایا جاتا ہے، مگر سنگین حالات میں عارضی طور پر " الضرورات تبیح المحظورات" وغیرہ قواعد کے تحت اس کی گنجائش دی جاسکتی ہے، اور نقصانات کی تلافی کے نام سے بیمہ کمپنی جو رقم دیتی ہے، وہ امداد و اعانت کے درجے میں ہوگی، اور اگر بیمہ شدہ اموال واملاک کی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی اپنے اوپر لیتی ہے، تو قمار کا شائبہ بھی باقی نہیں رہے گا، اور جمع شدہ رقم اجرت کے حکم میں ہو جائے گی اور نقصانات کی تلافی کی رقم ضمانت و تاوان کے درجے میں ہوکر جائز ہو جائے گی''۔(۱)

اوراس پر علامہ شامی کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے، اور وہ یہ ہے:

" وان كان صاحب السوكرة هو صاحب المركب يكون اجيراً مشتركاً (الى قوله) ولو قال ان كان مخوفاً وأُخذ مالك فأنا ضامن ضمن ". (۲)

(خلاصہ ترجمہ: اور اگر بیمہ کمپنی از خود مال پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو وہ اجیر مشترک ہوگا (شامی کا قول) اگر خوف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اس کا ضامن ہوں گا تو ضامن ہو جائے گا)

مگر احقر کو اس میں کلام ہے، جہاں تک مسئلہ ہے ضرورت شدیدہ کا، تو اس میں اگر واقعی ضرورت کا تحقق ہو جائے تو بے شک فقہی قواعد کی روشنی میں اس کی اجازت ہوسکتی ہے، مگر اصل سوال تحقق کا ہے، اور دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ عارضی

(۱) ایضاح النوادر: ۱۴۱-۱۴۵، از مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی (۲) الشامی: ۱۷۰/۴

گنجائش کب تک ہوگی؟ اس کے حدود کیا ہوں گے؟ اور ظاہر ہے کہ اس کا طے کرنا آسان نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اگر کمپنی خود مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو،تو جمع شدہ رقم اجرت مان لی جائے گی اور جو اس سے زائد نقصان کی تلافی میں لگا ہے،اس کو تاوان و ضمانت قرار دیا جائے گا،اس میں سے پہلی بات تو صحیح ہے مگر دوسری بات صحیح نہیں،اور نہ یہ علامہ شامی کا قول ہے بلکہ انہوں نے ایک اشکال کے ضمن میں لکھا ہے،اور آگے چل کر اس کی تردید کردی ہے،ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ:

''علامہ شامی نے اولاً بیمہ کی صورت کو جو ان کے زمانے میں ''سوکرہ'' کے نام سے جاری تھی،ناجائز قرار دیا،پھر اس پر ایک اشکال کیا کہ جس کے پاس ودیعت رکھی جائے،وہ اگر اس پر اجرت لے تو ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان آئے گا، اسی طرح بیمہ میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی جب اجرت لیتی ہے تو ہلاکت کی صورت میں اس پر ضمان آئے گا۔

علامہ شامی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر صاحب السوکرہ (کمپنی) ہی اموال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو تو جمع شدہ رقم کو اجرت قرار دیا جا سکتا ہے،اور وہ کمپنی ''اجیر مشترک'' ہوگی،لیکن اجیر مشترک ان چیزوں کا ضامن نہیں ہوتا جس سے بچنا ممکن نہ ہو،جیسے موت،غرق وغیرہ۔

اس کے بعد پھر ایک سوال قائم کیا کہ ''باب کفالة الرجلين'' میں یہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ اس راستہ سے جاؤ،یہ راستہ مأمون ہے،اور وہ شخص اس راستہ سے گیا اور اس کا مال پکڑ لیا گیا،تو یہ کہنے والا ضامن نہ ہوگا،اور اگر اس نے کہا کہ ''اگر یہ راستہ خوفناک ہوا اور تیرا مال پکڑ لیا گیا تو میں اس کا ضامن

ہوں، تو یہ شخص ضامن ہوگا۔ اور شارح نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس صورت میں اس دھوکہ دینے والے نے صاف طور پر راستہ کے سلامت رہنے کی ضمانت لی ہے، اس لئے اس پر ضمان آئے گا، بخلاف پہلی صورت کے کہ اس میں ''میں ضامن ہوں گا'' کہکر اس نے ضمانت نہیں لی ہے، اور ''جامع الفصولین'' میں لکھا ہے کہ اصل یہ ہے کہ دھوکہ کھانے والا دھوکہ دینے والے سے ضمان اس وقت لے سکتا ہے جبکہ دھوکہ آپسی لین دین میں ہو یا دھوکہ دینے والے نے سلامت رہنے کی ضمانت دی ہو، اس کی نظیر یہ ہے جیسے طحان (چکی پینے والے) نے گیہوں والے سے کہا کہ گیہوں ڈول میں ڈال دو، اس نے ڈال دیا اور وہ گیہوں سوراخ سے نکل کر پانی میں چلے گئے جبکہ طحان کو اس سوراخ کا علم بھی تھا تو یہ اس کا ضامن ہوگا؛ کیونکہ اس نے معاملہ میں دھوکہ دیا ہے جبکہ وہ سلامتی کا تقاضا کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس طرح ان صورتوں میں ضمان آتا ہے اسی طرح بیمہ کی صورت میں بھی ضمان لاگو کیا جاسکتا ہے۔

اس اشکال کا جواب علامہ شامی نے یہ دیا ہے کہ دھوکہ والی صورت میں یہ ضروری ہے کہ دھوکہ دینے والا تو پیش آنے والے خطرہ سے آگاہ ہو، جیسا کہ طحان والا مسئلہ دلالت کرتا ہے، اور دھوکہ کھانے والے کو اس کا علم نہ ہو۔

اس کے بعد علامہ شامی بیمہ کمپنی کے مسئلہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ مخفی نہیں کہ کمپنی دھوکہ دینے کا نہ ارادہ رکھتی ہے اور نہ غرق کا خطرہ پیش آنے سے پہلے اس کو اس کا علم ہوتا ہے، اور رہا چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ تو وہ تو سب کو معلوم ہے، کمپنی کو بھی اور بیمہ داروں کو بھی، لہٰذا یہ مسئلہ ہمارے مسئلہ سے متعلق نہیں ہے۔ (۱)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ علامہ شامی اس عبارت میں کمپنی پر

---

(۱) شامی: ۴/۱۷۰-۱۷۱

ضمان کو نادرست قرار دینا چاہتے ہیں، نہ یہ کہ اس کی حمایت کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔

نیز اس سلسلہ میں مولانا کو ایک غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ علامہ شامی کی عبارت میں جو بات بطور اشکال آئی ہے، اس کو علامہ شامی کا ''فتوی'' سمجھ لیا ہے، حالانکہ خود شامی نے اس کی تردید کردی ہے، اور پھر اس عبارت میں " وان کان مخوفاً الخ'' جو آیا ہے اس کا ترجمہ یا خلاصہ اس طرح کیا گیا ہے (اگر خوف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں الخ) یہ ترجمہ ومطلب بھی غلط ہے، کیونکہ یہ " مخوفاً ''کسی کا حال نہیں، بلکہ یہ " کان ''کی خبر ہے اور یہ پورا جملہ " قال'' کا مقولہ ہے، یعنی'' اگر وہ کہنے والا یہ کہتا ہے کہ ''اگر یہ راستہ خوفناک ہو، اور تیرا مال پکڑ لیا گیا تو الخ'' کما لا یخفی علی من امعن النظر.

## (۳) ذمہ داریوں کا انشورنس

ذمہ داری کے انشورنس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ تعلیم، شادی بیاہ، وغیرہ کی خاطر بچوں کے نام سے ان کے ذمہ دار مثلاً ماں باپ وغیرہ ایک متعینہ مدت کے لئے رقم جمع کرتے ہیں اور اس پر کمپنی تعلیم یا شادی وغیرہ کی ذمہ داری لیتی ہے، اور اس متعینہ مدت کے بعد کمپنی اپنی اس ذمہ داری کو پورا کر دیتی ہے، اور اگر جمع کرنے والوں نے درمیان میں جمع کرنا چھوڑ دیا تو کمپنی جمع شدہ رقم واپس نہیں کرتی۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں سود بھی ہے اور قمار بھی، اس لئے یہ صورت قطعی حرام و ناجائز ہے، سود اس لئے کہ اس میں مدت پوری کرنے کے بعد مقررہ رقم ملتی ہے، جو جمع شدہ رقم سے زائد ہوتی ہے اور لوگ اسی کے لالچ میں ذمہ داریوں کا بیمہ کراتے ہیں، اور قمار اس لئے کہ اس میں رقم مدت مقررہ تک جمع کی تو زائد ملتی ہے اور

اگر خدانخواستہ مدت مقررہ تک رقم جمع نہ کی گئی تو جو جمع کی ہے وہ بھی سوخت ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ صورت بھی ناجائز وحرام ہے۔

## (۴) میڈیکل انشورنس

ذمہ داریوں کے انشورنس ہی کے ضمن میں ''میڈیکل انشورنس'' اسکیم بھی آتی ہے جو آج کے دور میں وسیع پیمانے پر پھیل رہی ہے، بالخصوص اس لئے کہ آج کے دور میں بیماریوں کی کثرت وتنوع اور ان کی پیچیدہ صورت حال لوگوں کے لئے زیادہ پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ علاج معالجہ کی نئی نئی صورتوں اور طریقوں اور تشخیص امراض کے جدید آلات ومشینوں نے علاج کو بے حد مہنگا کر دیا ہے، اور متوسط طبقے کے لئے اس کا تحمل تقریباً ناقابل تصور ہوتا جا رہا ہے، اس صورتِ حال نے میڈیکل انشورنس اسکیم کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی ہے۔

میڈیکل انشورنس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک سال کی مدت کے لئے طے شدہ ایک رقم پالیسی ہولڈر کو جمع کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے انشورنس کمپنی اس سال کے درمیان لاحق ہونے والے بیماری کے علاج کی ذمہ داری لیتی ہے، اور اس کے لئے ایک بڑی رقم دیتی ہے جو معاملہ کے وقت ہی طے کر دی جاتی ہے، اور اگر وہ شخص اس سال بیمار نہ ہوا تو اس کی جمع شدہ رقم اس کو واپس نہیں کی جاتی۔

اس انشورنس کا حکم بھی واضح ہے اور اوپر بیان کردہ تفصیل کی روشنی میں اس کا جواب یہی ہے کہ یہ حرام وناجائز ہے؛ کیونکہ اس میں سود وقمار کی ساری لعنتیں موجود ہیں؛ کیونکہ اس میں ایک امکانی بلکہ متوہم بیماری پر معاملہ کیا جاتا ہے، جو اگر پیش آجائے تو پالیسی ہولڈر لاکھوں حاصل کر لے گا اور اگر نہ پیش آئے تو جو رقم جمع کی تھی، وہ بھی سوخت ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ خالص قمار ہے، اور جو رقم جمع شدہ رقم پر زیادہ

ملے گی وہ سود بھی ہے، اس طرح یہ معاملہ سود و قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بلا شبہ حرام ہے۔

بعض علماء نے اس پر کما حقّہ غور نہ کرنے کی وجہ سے اس کے جواز کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا ہے، اور اس کو تعاون کی ایک شکل قرار دیا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ تعاون کی یہ شکل سود و قمار ہونے کے باوجود جائز کس طرح ہو سکتی ہے؟

البتہ وہ ممالک جہاں میڈیکل انشورنس قانوناً لاگو ہے اور وہاں کے شہریوں یا واردین و صادرین کے لئے لازم کر دیا گیا ہے، وہاں مجبوری کی وجہ سے میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی، اس لئے نہیں کہ یہ جائز ہے بلکہ اس لئے کہ وہ مجبور ہیں اور اس سے بچنا بس میں نہیں، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں:

۱- ایک تو یہ کہ یہ جواز صرف ان کے لئے ہوگا جو مجبور ہیں، اور مجبور یا تو وہ لوگ ہیں جو ان ممالک کے اصل باشندے ہیں یا وہاں ان لوگوں نے بود باش اختیار کر لی ہے، یا وہ جو کسی شدید حاجت وضرورت کے لئے وہاں جاتے ہیں، اور جو لوگ محض سیر وتفریح کے لئے ایسے ممالک میں جاتے ہیں وہ اس جواز کے دائرے میں نہیں آتے، لہٰذا ان کو یا تو وہاں جانا نہیں چاہئے یا انشورنس نہیں کرانا چاہئے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اگر مجبوری کے تحت ایسے ممالک میں انشورنس کرائے تو لازم ہے کہ اپنی جمع شدہ رقم سے زائد جو کچھ کمپنی کی طرف سے ملے، وہ بلا نیتِ ثواب صدقہ کر دے۔ھذا ما عندی ،و اللّٰہ اعلم.

## (۵) کاغذات کا بیمہ

اس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ:

''اس کا رواج کچھ قدیم ہے، اسی لیے علامہ ابن عابدین شامیؒ جو متأخرین

میں افضل الفقہاء مانے گئے ہیں، انھوں نے اس کا ذکر کتاب الجہاد، باب المستامن میں بنام ''سوکرہ'' کیا ہے، مگر اس کی جو صورت لکھی ہے وہ موجودہ بیمۂ سندات و کاغذات سے کسی قدر مختلف ہے، اور علامہ شامیؒ نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ مگر انھیں کی تحریر سے بیمۂ سندات و کاغذات کی مروجہ صورت کا جواز معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نقل کیا ہے: "ان المودع اذا اخذ الاجرة على الوديعة يضمنها اذا هلكت" (شامی) (یعنی جس شخص کو کوئی سامان بغرضِ حفاظت دیا جائے اگر وہ اس کی حفاظت کا معاوضہ لیتا ہے تو ضائع ہو جانے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا) ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک وغیرہ جو سندات و کاغذات وغیرہ سربمہر کر کے حفاظت کے وعدہ پر لیتا ہے اور اس کی حفاظت کی فیس بھی لیتا ہے، تو ضائع ہو جانے کی صورت میں مذکورہ روایت کی بنا پر ضائع شدہ کاغذات کا ضمان اس پر لازم آئے گا۔ (۱)

## انشورنس میں سود لیے بغیر شرکت کا حکم

ایک سوال اس سلسلہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص انشورنس کے معاملے میں سود سے بچا رہے، اور صرف اپنی اصل رقم کی واپسی چاہتا ہو، تو کیا یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں ایک تو اس پر غور کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص اس معاملہ میں سود لینے سے محترز رہا تو وہ اس برائی ومفسدہ سے بچ تو گیا، لیکن جب اس کو یہ معلوم ہے کہ اس کا اس معاملہ میں لگایا ہوا روپیہ، سودی کاروبار میں لگایا جاتا ہے، تو یہ سودی کاروبار میں تعاون ہوا، اور یہ بھی ناجائز ہے؛ کیوں کہ اسلام میں حرام کام کا تعاون

(۱) رسالہ بیمۂ زندگی، مندرجہ جواہر الفقہ: ۱۸۲/۲-۱۸۳

بھی حرام ہے، درمختار میں ہے:" ویکرہ تحریماً بیع السلاح من أهل الفتنة، إن عَلِمَ لأنّه إعانة علی المعصیة، وبیع ما یتخذ منه کالحدید ونحوه یکره لأهل الحرب لا لأهل البغی لعدم تفرّغهم لعمله سلاحاً ." (۱)

اوراوپر وہ حدیث گزرچکی ہے جس میں سود لینے، سود دینے اوراس پر گواہ بننے اوراس کا حساب لکھنے کوایک ہی درجہ کا گناہ قرار دیا گیا ہے، جب گواہ بننا اورحساب لکھنا بھی تعاونِ حرام میں داخل ہوجاتا ہے، تو جانتے بوجھتے، اپنا روپیہ ایسے لوگوں کے حوالہ کرنا جواس کوسود پر لگاتے ہوں، کیوں کرتعاونِ حرام نہ ہوگا؟ اس لیے سود لیے بغیر بھی اس معاملہ میں شرکت ناجائز ہوگی۔

اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا ہے کہ اس معاملہ میں قمار بازی بھی ہے، اگر سود نہ لیا جائے تو ایک گناہ ختم ہوا، مگر قمار بازی بھی خود ایک مستقل گناہ ہے، اس کا کیا ہوگا؟ بخاری کی ایک حدیث میں ہے: ﴿**من قال لصاحبه تعال أقامرک فلیتصدق**﴾ (جس نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ چل، ہم قمار بازی کریں گے، تو اس کو چاہئے کہ صدقہ دے)(۲)

جب کسی سے صرف یہ کہنا کہ چلو، جوا کھیلیں، موجبِ تصدق ہے، تو خود قمار بازی کا کیا حال ہوگا؟ لہٰذا سود لیے بغیر بھی اس میں شرکت دو وجہ سے ناجائز ہوگی، ایک تو اس لیے کہ اس میں شرکت سودی کاروبار کے تعاون کا ذریعہ ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس میں قمار بازی کا گناہ ہے۔

## ربوا یا امداد؟

اور یہ کہنا کہ انشورنس کے معاملے میں کمپنی جو رقم سود کے نام سے ادا کرتی

(۱) درمختار: ۲۶۸/۴ (۲) بخاری: ۴۴۸۲، مسلم: ۳۱۰۷

ہے، وہ ربوااور سود نہیں ہے، بلکہ وہ بیمہ داروں کی امداد واعانت اور تبرع واحسان ہے، یہ غلط ہے۔

کیوں کہ ہر چیز کا حکم اس کی حقیقت سے متعلق ہوا کرتا ہے، نام سے نہیں، اگر کوئی شخص شراب کو شربت کا نام دیدے، تو صرف نام کے بدل جانے سے اس پر حلت کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ دیکھا یہ جائے گا کہ اس مسمی بہ شربت شئ میں نشہ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بلاشبہ حرمت کا حکم لگایا جائے گا، اگر چہ نام، اس کا شربت ہی ہو جائے۔ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ انشورنس کے معاملے میں جو رقم زائد دی جاتی ہے، حقیقت کے لحاظ سے ربوا شرعی ہے، اس کو امداد واعانت یا تبرع واحسان کا نام دینے سے اس کے حکم حرمت میں کوئی فرق نہ آئے گا، بلکہ وہ بدستور حرام ہی ہوگا۔

پھر جس کو یہاں امداد واحسان کہا جا رہا ہے، اس پر امداد واحسان کی تعریف بھی صادق نہیں آتی؛ کیوں کہ امداد واحسان میں جبر نہیں ہوتا، اور انشورنس کی اس زائد رقم میں جبر ہوتا ہے۔ خود کمپنی بھی اور بیمہ دار بھی اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر کمپنی زائد رقم ادا نہ کرے تو قانونی چارہ جوئی سے وصول کی جاسکتی ہے۔

بتائیے یہ کیسا احسان ہے جس میں جبر بھی ہوسکتا ہے؟ غرض یہ کہ یہ ربوا، ربوا ہی ہے اور حرام ہے، تاویلوں اور ناموں کی تبدیلی سے اس کے اصل حکم میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔

## دارالحرب میں سود کا مسئلہ

جب بھی انشورنس اور اس میں سود ہونے کی بحث اٹھتی ہے تو عام طور پر دار الحرب میں سود کا مسئلہ بھی زیر بحث لایا جاتا ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس لئے یہاں سود کی گنجائش ہے، لہٰذا انشورنس بھی درست

ہونا چاہئے۔

اس پر گفتگو سے قبل ہم اصل مسئلہ کی وضاحت کرتے ہیں، پھر مسئلہ زیرِ بحث کی طرف آئیں گے۔ دارالحرب میں حربی سے اس کی رضامندی کے ساتھ سود لینے میں ائمہ کا اختلاف ہے۔امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ جواز کے قائل ہیں،اور امام ابو یوسفؒ اور ائمہ ثلاثہ (امام شافعیؒ،امام مالکؒ،امام احمدؒ) عدم جواز کے قائل ہیں.

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

( ولا بين حربي ومسلم ) مستأمن، ولو بعقد فاسد أو قمار (ثمة) لأن ماله ثمة مباح، فيحل برضاه مطلقاً بلاغدر خلافاً للثانى و الثلاثة. (١)

بحرالرائق میں ہے:

قوله:(ولابين الحربي والمسلم ثمة ) أى لاربا بينهما في دارالحرب عند هما خلافاً لأبي يوسفؒ. (٢)

امام اعظمؒ جو جواز کے قائل ہیں،ان کے نزدیک اس کے جواز کی چند شرطیں ہیں،ان پر بھی نظر ڈال لینا ضروری ہے:

(۱) حربی سے سود لینے والا ایسا مسلمان ہو جو دارالاسلام سے امن لے کر دار الحرب آیا ہو، جسے فقہاء کی زبان میں مستامن کہتے ہیں، درمختار کی مذکورہ بالا عبارت میں مسلم کے ساتھ مستامن ہونیکی قید مصرح ہے .لہٰذا جو مسلمان دارالحرب ہی میں رہتا ہو،مستامن نہ ہو،وہ حربی کافر سے سود نہیں لے سکتا .

(۲) یا سود لینے والا مسلمان اسیر ( قیدی ) ہو،قال ابن عابدين : قوله :

(۱) درمختار مع الشامی:۱۸٦/۵ (۲) البحرالرائق:١٣٥/٦

(ومسلم مستأ من) ومثله الأسير.(۱)

اوراسیر کے سود لینے کے جواز میں امام ابو یوسف بھی امام اعظمؒ کے ساتھ متفق ہیں، کما صرح به الشامي حيث قال: وخلافه (أى أبي يوسفؒ) في المستأمن دون الأسير.(۲)

(۳) یا یہ سود لینے والا ایسا مسلمان ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو اور ہجرت نہ کیا ہو، فی الدر المختار: قلت: و منه يعلم حكم من أسلما ثمة،ولم يهاجرا، قال الشامي: أى يعلم مما ذكره المصنف مع تعليله أن من أسلما ثمة ولم يهاجرا لا يتحقق الربا بينهما أيضاً.(۳)

(۴) یہ معاملہ حربی کافر سے ہو، مسلم اصلی، یا ذمی کافر سے نہ ہو، چنانچہ شامی نے لکھا ہے: احترز بالحربي عن المسلم الأصلي والذمي.(۴)

(۵) یا یہ معاملہ اس مسلمان سے ہو جو دارالحرب میں اسلام لایا ہو اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کیا ہو، درمختار و بحرالرائق میں ہے:" وحكم من أسلم فى دار الحرب ولم يهاجر كحربي، فللمسلم الربا معه خلافاً لهما."(۵)

یہ تو اصل مسئلہ ہوا، اب سب سے اہم بات اس کو ہندوستان پر منطبق کرنے کی ہے، بعض حضرات اگر چہ اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں انشورنس اور سود کے جواز پر فتوی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان پر اس کو منطبق کرنا سخت ترین دشوار بات ہے، اولاً تو اس لیے کہ موجودہ ہندوستان کا دارالحرب ہونا خود مختلف فیہ مسئلہ ہے، اور ہمارے بہت سے اکابر نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا ہے، تو اس

(۱) شامی علی الدر: ۱۸۶/۵ (۲) شامی: ۱۸۶/۵ (۳) الدر المختار مع الرد المحتار: ۱۸۶/۵-۱۸۷
(۴) شامی: ۱۸۶/۵ (۵) درمختار مع الشامی: ۱۸۶/۵، البحر الرائق: ۱۴۷/۶

میں سود کے جواز کا مذکورہ مسئلہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے؟

ثانیاً اس لیے کہ یہ سود لینے کا جواز اسی وقت ہے جب کہ یہ حربی کافر سے، یا اس مسلمان سے لیا جائے جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کیا ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان شرائط کا تحقق یہاں ممکن نہیں۔

ثالثاً اس لیے کہ موجودہ زمانے میں دارالحرب میں اسلام لانے کے بعد دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنا، ناممکن ہے، اور خود دارالاسلام ایسے افراد کو شہریت دینے کو تیار نہیں، ایسی صورت میں ہجرت نہ کرنے سے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کا مال غیر معصوم ہے؟ پھر اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آج ہندوستان میں کسی بھی مسلمان کا مال معصوم نہ رہے۔ اور ایک دوسرے کا مال لے لینا اور ضائع کر دینا گناہ و ضمان کا موجب نہ ہو، اور یہ بات جس عظیم فتنہ کا باعث ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

## ایک اہم مسئلہ

اس کے ساتھ ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ امام اعظمؒ نے جو دار الحرب میں عقود فاسدہ، مثل ربوا، وغیرہ کو جائز قرار دیا ہے، اس میں یہ بھی شرط ہے کہ مسلمان، حربی کافر یا حربی مسلمان کے مال سے نفع اندوز ہو، اور کافر کو مسلمان کے مال سے نفع اندوز ہونے کا موقعہ نہ ملے، اور اگر خدانخواستہ ان میں سے کسی معاملے میں حربی کافر کو نفع ہو تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

علامہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں فرمایا کہ:

إلا أنّه لا يخفى أنه إنما اقتضى حلّ مباشرة العقد إذا كان الزيا دة (الربوا ) ينالها المسلم، و الربا أعم من ذلك، إذ يشمل ما إذا كان الد رهمان من جهة المسلم أو من جهة الكافر، وجواب المسئلة بالحلّ عام

في الوجهين، وكذا القمار قد يفضى إلى أن يكون مال الحظر للكافر، بأن يكون الغلب له، فالظاهر أن الإبا حة بقيد نيل المسلم الزيادة وقد الزم الاصحاب فى الدرس ان المراد من حل الربا و القمار ما اذ ا حصلت الزيادة للمسلم نظرا الى العلة وان كان اطلاق الجواب خلافه واللّٰه تعالى اعلم.(۱)

علامہ ابن نجیم مصریؒ فتح القدیر کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"إلا أنّه لا يخفى أنه إنما اقتضى حلّ مباشرة العقد إذا كان الزيادة ( الربوا ) ينالها المسلم، و الربا أعم من ذلك، إذ يشمل ما إذا كان الد رهمان من جهة المسلم أو من جهة الكافر، وجواب المسئلة بالحلّ عام في الوجهين .(۲)

نیز علامہ شامیؒ نے ردالمختار میں فتح القدیر سے اس سب کونقل کرنے کے بعد فرمایا کہ:

قلت ويد ل على ذالك مافى السير الكبير و شرحه حيث قال واذا دخل المسلم دارالحرب بامان فلاباس بان ياخذ منهم اموالهم بطيب انفسهم باى وجه كان لانه انما ياخذ المباح على وجه عرى عن الغدر فيكون ذلك طيباً له والاسير والمستامن سواء حتى لوبا عهم درهماً بدرهمين اوباعهم ميتة بدراهم اواخذ مالاً منهم بطريق القمار فذلك كله طيب له اه ملخصاً فانظركيف جعل موضوع المسئلة الاخذ من اموالهم برضاهم فعلم ان المراد من الربا والقمار فى كلامهم ما كان على هذا

(۱)فتح القدیر:۷/۳۹ (۲)البحرالرائق:۶/۱۳۶

الوجه وان كان اللفظ عاما لان الحكم يد ورمع علته غالبا ۔(۱)

حضرات فقہاء کرام کی ان تصریحات سے یہ واضح ہو گیا کہ دارالحرب میں عقود فاسدہ مثل ربا و قمار، اسی وقت جائز ہیں جب کہ ان کا نفع مسلمانوں کو حاصل ہو، ورنہ جائز نہیں۔ اب اس پر غور کیجئے کہ انشورنس میں جو قمار ہوتا ہے اس کا نفع کبھی مسلمان کو ہوتا ہے جو اس میں شریک ہے، جب کہ مدت مقررہ سے پہلے بیمہ شدہ شخص وشئی، ہلاک ہو جائے، اور کبھی کمپنی کو نفع ہوتا ہے جب کہ مدت مقررہ کے بعد ہلاک ہو، ایسی صورت میں انشورنس کی اجازت دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کی صورت میں بھی نہیں مل سکتی۔ الغرض ہندوستان میں امام اعظمؒ کے مسلک پر بھی اس کے جواز کا مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ (واللہ اعلم)

اسکے علاوہ احتیاط کے بھی خلاف ہے۔ لہٰذا جمہور کی رائے کے مطابق عدم جواز پر ہی فتوی دینا چاہئے۔

## نجی کمپنیوں اور حکومتی اداروں میں فرق

سودی کاروبار یا قمار، نجی کمپنیاں کرتی ہوں یا حکومتی ادارے، مسئلہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ہر صورت میں انشورنس کا معاملہ ناجائز ہوگا۔ البتہ حادثہ کی صورت میں جو رقم، حکومت کا یہ ادارہ دیگا، اس کو امداد کہا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: ''ایک فرق (حکومتی ادارے اور نجی کمپنیوں میں) سامنے رکھنا ضروری ہوگا کہ حادثہ کی صورت میں جو رقم، حکومت سے ملے گی اسکو حکومت کا عطیہ قرار دیا جا سکتا ہے؛ کیونکہ ایسے حالات میں امداد کرنا عموماً حکومتوں کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، مگر ربا کا جو معاملہ، اسی طرح قمار

(۱) شامی: ۱۸۶/۵

کا جو معاملہ، انشورنس میں ہے وہ بہرحال ناجائز ہوگا۔ لہٰذا اس میں شرکت جائز نہیں ہوگی اور نہ سود کی وہ رقم جائز ہوگی جو حکومتی ادارہ اس معاملہ میں دیگا۔(۱)

## ایک علمی مغالطہ

سوالنامہ میں پوچھا گیا ہے کہ اگر یہ کاروبار، حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بنیاد پر کہ خزانۂ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیہ قرار پا کر ربوا کے حدود سے خارج ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا اس صورت میں یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ غالباً یہ مسئلہ اس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے کہ کتب فقہ میں تحقق ربوا کی جو شرائط بیان کی گئی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بدلین مال مشترک نہ ہو، جس میں یہ معاملہ کرنے والے بہ شرکت عنان یا بشرکت مفاوضہ شریک ہوں۔ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے :"قال فی الشر نبلالیة: ومن شرائط الربا، عصمة البدلین وکونهما مضمونین بالاتلاف...... الی ان قال...... ومنها ان لایکون البدلان مملوکین لاحد المتبائعین کالسید مع عبده ولا مشترکین فیهما بشرکة عنان ومفاوضة کما فی البدائع". (۲)

تو جیسے عنان ومفاوضہ کے دو شریک کے درمیان ربوا متحقق نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں بھی چونکہ حکومت کا خزانہ مشترک ہے اس لیے یہاں بھی ربوا کا تحقق نہ ہونا چاہئے۔

مگر یہاں ایک مغالطہ ہے۔ اولا اس لیے کہ خزانۂ حکومت میں رعیت کی شرکت پر، شرکت عنان ومفاوضہ کی تعریف صادق نہیں آتی، اور یہ عدم تحقق ربوا، اسی صورت میں ہے جب کہ شرکت مفاوضہ وعنان ہو۔

---

(۱) جواہر الفقہ :۲/۱۸۷ (۲) الشامی: ۵/۱۶۸

**شرکت مفاوضہ کی تعریف ہدایہ میں یہ کی گئی ہے** :"اما شرکة المفاوضة فھی ان یشترك الرجلان فیتساویان فی مالھما وتصرفھما و دینھما ولا یجوز بین المسلم والکافر ولا بین الصبی والبالغ". (۱)

**غور کرلیا جائے کہ یہ تعریف خزانۂ حکومت میں رعیت کی شرکت پر صادق بھی آتی ہے یا نہیں، اور شرکت عنان یہ ہے کہ**:"اما شرکة العنان فتنعقد علی الوکالة دون الکفالة وھی ان یشترك اثنان فی نوع بزّ اوطعام ویشترکان فی عموم التجارات ولا یذکران الکفالة."(۲)

**ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی اس پر صادق نہیں آتی۔ پھر اس سے قطع نظر مال شرکت میں عدم تحقیق ربوا کا مسئلہ، اس وقت ہے جب کہ ربا کا معاملہ کرنے والے، صرف اسی مال سے معاملہ کریں، اور اگر ایک طرف مال شرکت ہو، دوسری طرف مال شرکت نہ ہو تو یہ مسئلہ نہیں ہے۔ چنانچہ ابن نجیم مصریؒ نے لکھا ہے**:"اشار المصنفؒ الی انه لا ربوا بین المتفاوضین وشریکی العنان اذا تبایعا من مال الشرکة وان کان غیره جری بینھما." (۳)

**علامہ ابن عابدین شامیؒ نے فرمایا**:" الظاھر ان المراد اذا کان من البدلین من مال الشرکة ،اما لو اشتری احدھما درھمین من مال الشرکة بدرھم من ماله مثلاً فقد حصل للمشتری زیادة وھی حصة شریکه من الدرھم الزائد بلا عوض وھو عین الربا". (۴)

**الغرض شرکت مفاوضہ وعنان کا سہارا لے کر خزانۂ حکومت سے سود لینے یا اس کو دینے کا مسئلہ پیدا کرنا غلط ہے۔**

(۱)الھدایة:۱۰۵/۲ (۲)الھدایہ:۶۰۹/۲ (۳)البحر الرائق:۱۳۵/۶
(۴)الشامی:۱۸۵/۵۔۱۸۶

پھر یہ بھی غلط ہے کہ خزانۂ حکومت کو مال مشترک قرار دیا جائے؛ کیوں کہ مال مشترک کی حقیقت یہ ہے کہ کسی مال میں دو یا چند اشخاص باعتبار ملکیت کے شریک ہوں، اور ایسا مال جس میں باعتبار ملکیت کے شراکت نہ ہو تو اس کو مال مشترک نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مثلاً میاں اور بیوی کا مال شرعاً الگ الگ ہوتا ہے۔ اور میاں کے مال میں بیوی کا حق نفقہ ہوتا ہے، مگر میاں کے مال میں بیوی کی باعتبار ملکیت شراکت نہیں ہوتی، لہٰذا اگر میاں بیوی آپس میں ربوا کا معاملہ کریں، تو ربوا کا تحقق ہو جائے گا، کیوں کہ یہاں مال مشترک نہیں ہے۔

اسی طرح باپ کے مال میں بیٹے کا اور بیٹے کے مال میں باپ کا حق شرعاً ثابت ہے، مگر اس کے باوجود ان کے مالوں کو مشترک اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہر ایک کی ملکیت الگ الگ ہے، لہٰذا باپ اور بیٹے کے درمیان بھی ربوا کا تحقق ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ خزانہ حکومت میں ہر فرد رعیت کا حق تو بلا شبہ ہے، مگر صرف حق کے ثابت ہونے سے مال کا مشترک ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیوں کہ ملکیت اس کے لیے ضروری ہے اور یہاں ملکیت ثابت نہیں، لہٰذا اس میں ربوا جاری ہوگا۔ (واللہ اعلم)

## انشورنس کے سود کے مصارف

اگر کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہوا اور اس سے حاصل ہونے والا سود، ٹیکس میں دیا جائے یا ان کاموں میں لگایا جائے جو حکومت کے ذمہ واجب ہیں یا ایسے کاموں پر لگایا جائے جو حکومت کے ذمہ تو نہیں ہیں، مگر حکومت سے ان میں امداد لی جاتی ہے اور حکومت ان میں امداد بھی کبھی کر دیتی ہے۔ تو کیا انشورنس کا یہ معاملہ

جائز ہوگا؟

یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں: ایک یہ کہ ان مصارف کے لیے انشورنس میں حصہ لینا، دوسرے حصہ لینے کے بعد اس سود کو ان مصارف میں خرچ کرنا۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ صرف مصارف کا سوال ہے، لہٰذا اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی نے غلطی سے انشورنس کا معاملہ کرلیا، اور اس کے نام سود کی رقم آ گئی تو یہ شخص اس سود کی رقم کو:

(۱) ٹیکس میں (اس ٹیکس میں جو حکومت رعایا سے ظلما وصول کرتی ہے۔ جیسے انکم ٹیکس وغیرہ) دے سکتا ہے۔

(۲) اور ان کاموں میں دے سکتا ہے جو حکومت کے ذمہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور جو کام حکومت کے ذمہ نہیں ہے ان میں لگانا درست نہ ہوگا؛ کیونکہ یہ شخص اپنے سود کی رقم ایک ایسے کام میں لگا رہا ہے جس کا نفع ہر کس و ناکس کو پہنچتا ہے، خواہ امیر ہو یا غریب، حالانکہ اس رقم کا مصرف امیر لوگ نہیں ہو سکتے؛ کیونکہ حرام مال کے سلسلہ میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اس کو صدقہ کرنا واجب ہے۔ اور صدقہ کی حقیقت ہے تمليك المال من ا لفقير۔(۱)

لہٰذا غیر فقیر کو اس مال سے نفع پہنچایا نہیں جا سکتا۔ اور پہلی دو صورتوں (ٹیکس اور حکومت کے ذمہ واجب کاموں) میں اس مال کو دینے کا جواز اس پر ہے کہ یہ سود کی رقم اصل میں یہ حکم رکھتی ہے کہ اس کو واپس لوٹا دیا جائے. لہٰذا واپس لوٹانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کے ذمہ جو کام ہے وہ اس سے کر دیا جائے یا وہ ظلما جو اصول کرر ہا ہے اس میں اس کو دے دیا جائے۔ الغرض ٹیکس میں یا حکومت کے ذمہ واجب

(۱) فتح القدیر:۲۰/۲

کاموں میں خرچ کر دینا اس رقم کا جائز ہوگا۔ اور حکومت کے غیر واجب کاموں میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح فقراء پر خرچ کرنا بھی جائز ہوگا کہ وہ اس کا مصرف ہیں (كما هو ظاهر لان الصدقة هی تمليك المال من الفقير كما مر) مگر اس میں ثواب کی نیت جائز نہ ہوگی، کیونکہ حرام مال کو خرچ کرنے میں ثواب نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسرے مسئلہ سے متعلق کلام تھا۔ اور پہلے مسئلہ کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ ان مصارف میں خرچ کرنے کے لیے انشورنس کا معاملہ کرنا بعض صورتوں میں جائز ہے۔

(۱) ٹیکس میں ادا کرنے کے لیے (مراد وہ ٹیکس ہے جو حکومت ظلماً لیتی ہے) (۲) حکومت کے ذمہ واجب کاموں میں۔ اور ان صورتوں میں ناجائز ہے۔

(۱) ایسے کاموں میں خرچ کرنے کے لیے جو حکومت کے ذمہ واجب نہیں ہیں۔

(۲) فقیروں اور محتاجوں کو دینے کے لیے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ ''رسالہ بیمۂ زندگی'' میں لکھتے ہیں:

(الف) یہ صورت جائز ہے کہ حکومت کی طرف سے جو غیر شرعی ٹیکس عائد ہیں، ان کو ادا کرنے کے لیے حکومت ہی سے اس کے قانون کے مطابق کوئی رقم حاصل کر لی جائے، خواہ اس کے حصول کا ذریعہ ربوا کے عنوان کے تحت آتا ہو، مگر شرط یہ کہ صرف اتنی ہی رقم اصول کی جائے جتنی حکومت کے غیر شرعی ٹیکسوں میں دینی ہے۔

(ب) از روئے قواعد تو اس کی (یعنی حکومت کے ذمہ واجب کاموں میں خرچ کرنے کے لیے انشورنس کے ذریعہ سود لینے کی) بھی گنجائش ہے، مگر انفرادی طور پر عملاً ایسا ہونا مشکل ہے اس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ اس رقم کو صرف کرنے والے اس سے اپنا مفاد بھی حاصل کریں گے جو ناجائز ہے۔ ہاں کسی ایسے ادارے کو یہ رقم سپرد

کردی جائے جو ذمہ داری کے ساتھ انہیں کاموں میں صرف کردے جنکے پورے کرنے کی ذمہ داری حکومت پر تھی، مگر حکومت کسی وجہ سے اسکو پورا نہیں کررہی ہے، تو اس صورت میں مضائقہ نہیں (ج) جو کام حکومت کی ذمہ داری اور فرائض میں داخل نہیں، کبھی تبرعا حکومت بھی کردیتی ہے۔ ان کاموں میں صرف کرنے کے لیے حکومت کی بیمہ پالیسی سے کسی ناجائز طریقہ پر رقم حاصل کرنا جائز نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ جواز کی علت، اس تاوان سے بچنا ہے جو حکومت کی طرف سے غیر شرعی طور پر عائد کیا گیا ہو۔ وہ علت صورت (ج) میں مفقود ہے۔ صدقہ کرنے کی نیت سے سود یا قمار کی رقم، حاصل کرنا جائز نہیں ہوسکتا الخ۔''(۱)

## ایک قابل توجہ امر

یہ تو فی حد ذاتہ مسئلہ کی توضیح ہوئی، مگر ایک بات یہاں نہایت ضروری قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ مذکورہ بنیاد پر بعض صورتوں میں انشورنس کے معاملہ کی گنجائش دی جائے گی، اور عوام الناس کو اس کے جواز کا فتوی دیا جائے گا، تو عوام الناس، نہ اسکی بنیاد کو دیکھیں گے اور نہ جواز کے حدود و قیود اور شرائط کو، بلکہ ان سب سے قطع نظر صرف جواز کے الفاظ کا سہارا لے کر، مطلقاً انشورنس کے جواز پر مصر ہوں گے، اور ہر قسم کے انشورنس میں بلا قید و شرط، شریک ہو جائیں گے۔ جیسا کہ عوام کی عادت سے ظاہر ہے۔ اس لیے احتیاط اور عوام کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ اس معاملہ کو مطلقا ناجائز قرار دیا جائے تا کہ عوام کسی معصیت میں مبتلا نہ ہوں۔ (واللہ اعلم)

## انشورنس کی متبادل شرعی شکل

اب سب سے اہم سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب انشورنس کی مروجہ صورت ''سود

(۱) جواہر الفقہ: ۱۸۷/۲

وقمار'' پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نا جائز قرار پائی، تو اس سے منسلکہ مصالح ومنافع جو شرعاً بھی نا قابل التفات نہیں ہیں ،ان کو حاصل کرنے کے لیے اس کی متبادل صوررت کیا ہوسکتی ہے، جس میں کوئی شرعی محذور لازم نہ آئے ؟ بلا شبہ یہ سوال فی نفسہ بھی اور آج کے ماحول ومعاشرہ کے اعتبار سے بھی، نہایت اہم اور نا قابل فراموش ہے۔ آج کسی چیز کے بارے میں عدم جواز کا فتوی دیدینا کافی نہیں ہے کہ یہ کبھی لوگوں کو بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار کردیتا ہے اور کبھی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حضرات علماء اس پر غور کریں۔

(۱) اسلام میں سرمایہ کے تحفظ اور اس میں اضافے کے لیے، بیع کی شکل موجود ہے، جو ربا کے بالمقابل تجویز کی گئی ہے، پھر اس کی متنوع شکلوں میں سے مضاربت اور شرکت بڑے منافع اور مصالح پر مشتمل ہیں.

(۲) حوادث میں جانی و مالی نقصانات کی تلافی کے لیے اسلام میں تعاون علی الخیر اور امداد باہمی کی مختلف شکلیں مشروع ہیں۔

(۳) پسماندگان کے تحفظ و بقاء کے لیے وراثت، وصایت کے قوانین موجود ہیں، معاقل کا نظام بھی مقتول کے پسماندگان کے تحفظ و بقاء کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا انشورنس کے جو مصالح ہیں، سرمایہ کا تحفظ، اس میں اضافہ، امداد باہمی، حوادث میں نقصان کی تلافی اور پسماندگان کا تحفظ و بقاء، وہ سب اسلامی نظام کے مطابق ان مذکورہ شکلوں کو رائج کرکے حاصل کئے جاسکتے ہیں، اور ان میں سے بعض چیزوں کو انشورنس کمپنی میں شامل کرکے بھی ان مصالح کو حاصل کیا جاسکتا ہے مثلا:

(۱) انشورنس کمپنی، بیمہ کے طالبوں سے جو رقم قسط وار اصول کرتی ہے، اس کو مضاربت وشرکت کے اسلامی اصولوں پر تجارت میں لگائے اور اس سے نفع لیکر کمپنی

اور طالب بیمہ قاعدے کے مطابق تقسیم کرلیں ،اور نقصان سے بچنے کے لیے اسکی نگرانی اچھی طرح کی جائے.

(۲) نیز طالب بیمہ سے ایک معتد بہ رقم، باہمی امداد وتعاون اور حوادث میں نقصان کی تلافی کے وعدہ پر الگ سے وصول کرے،اور یہ رضا مندی سے ہو،اور اس رقم سے صرف ان کی امداد کی جائے جو کمپنی کے حصہ دار ہیں،اور اس معاہدہ کے پابند بھی،اور اس کے لیے مناسب قواعد وقوانین ماہرین معاشیات وعلماء شریعت کو جوڑ کر بنائے جائیں، اور پوری دردمندی ودل سوزی کا جذبہ لیکر کام کیا جائے ، اور صرف تجارت مقصود نہ ہوتو کوئی وجہ نہیں کہ اس طرح کا نظام نہ بن سکے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم . فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی